رشید جہاں کے افسانوں کی بُنت میں سماجی رویوں کی بازیافت؛ بحوالہ تانیثیت

ڈاکٹر نقیب احمد جاؔن

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اُردو، ویمن یونیورسٹی صوابی

/ڈاکٹر منزہ مبین

اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو، ویمن یونیورسٹی صوابی

Abstract:

Society marks its dwellers in a disparate way through its norms and customs and everyone shows distinct reaction to these norms and customs and after all when it comes to the second half of the society i.e Females these norms become more ridiculous. Majority of the people abide by norms of their society without showing any resistance, nevertheless what they feel and bear but some of them are those who resist against the destroying effects of these customs. Amongst them poets and writers are the people who see, judge, reveal and raise voices against those customs and norms, which cause destructions and restlessness in the society. They used to inculcate their ideas in the dwellers to resist such norms. Dr. Rashid Jahan is a famous Indian feminist writer whose short stories railed against social inequity, hypocritical maulvis and the exploitation of women in a deeply patriarchal society. She was the first women to write about the plight of women with courage and forthrightness. This article sheds light on those facets in short stories of Dr. Rashid Jahan which demonstrate attitudes of the society.

Key Words: Society, Norms, Rashid Jahan, Short Story, Attitudes, Feminism

کی ورڈز: سماج، اقدار، رشید جہاں، افسانہ، رویے، تانیثیت

سماج یا معاشرہ انسانوں کی اجتماعی وانفرادی زندگی پر طرح طرح سے اثر انداز ہوتا ہے۔ فرد کے لیے سماج یا معاشرے کا اس کی ذاتی زندگی میں نفوذ کبھی باعثِ راحت تو کبھی باعثِ کُلفت ہوتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ جب چیزیں اور کام انسان کی مرضی کے مطابق ہوتے رہتے ہیں تو وہ خوش اور سرشار رہتا

ہے اور جب کہیں معاملہ اس کے برعکس ہو تو یہی سرشاری اور خوشی غم واندوہ، ناراضگی اور نفرت میں بدل جاتی ہے۔ جہاں انسان کے فائدے کی بات ہوتی ہے وہ اس کی خاطر بہت سارے اُمور اور تکالیف کو نظر انداز کر دیتا ہے لیکن جہاں کہیں اس کو معمولی نقصان اٹھانا پڑے تو اس مقام پر پھر وہ اکثر و بیشتر ایسی چیزوں اور امور کی بھی مخالفت شروع کر دیتا ہے جو دوسروں کے لیے شاید فائدہ مند ہوں، لیکن چونکہ اس کی ذات کو ان سے کوئی فائدہ نہیں تو ان کی مخالفت پر کمربستہ ہو رہتا ہے۔ ہر سماج اور معاشرے کے اپنے اقدار و روایات ہوتے ہیں، رسوم و رواج ہوتے ہیں۔ یہ اقدار و روایات اور رسوم و رواج کلی طور پر معاشرے کے ہر فرد کے مفاد میں بھی نہیں ہو سکتے اور ایسا بھی نہیں کہ یہ سب معاشرے کے تمام افراد کو نقصان پہنچانے کے لیے وضع کیے گئے ہوں۔ ایک ہی وقت میں ایک رسم یا رواج دو مختلف افراد کے لیے مختلف یا متضاد اثر کا حامل ہو سکتا ہے۔ کوئی ایک رسم جو ایک وقت میں کسی ایک فرد کے لیے فائدے کا باعث بن رہی ہے اسی لمحے وہ کسی دوسرے فرد کے لیے نقصان کا باعث ہو سکتی ہے۔ اور یہ فطری امر ہے کہ کوئی بھی انسان اپنا نقصان برداشت نہیں کرتا ہے۔ سو جس کا نقصان ہو رہا ہے وہ فرد اس رسم یا رواج کا مخالف بنے گا اور اس سے بغاوت کرے گا۔ کبھی کبھی سماج سے یہ بغاوت کامیاب ٹھہرتی ہے اور باغی کو نقصان کے بجائے فائدہ مل ہی جاتا ہے لیکن زیادہ تر یہ ہوتا ہے کہ سماج سے بغاوت کی صورت میں فردِ واحد کو ہی نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ ایک فرد بہر حال پورے معاشرے یا سماج کا مقابلہ کسی بھی صورت نہیں کر سکتا ہے۔ سماج اور اس کے رسوم و رواج کا مقابلہ کرنا، ان سے بغاوت کرنا ہر کسی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بہت ہی حوصلہ مند لوگ ایسا کر سکتے ہیں، کیونکہ یہ کام ایک پورے سسٹم کے خلاف ہو جاتا ہے۔ جہاں نہ صرف یہ کہ آپ کو اپنے بغیر تمام لوگوں کی مخالفت مول لینی ہوتی ہے بلکہ اکثر اس مخالفت اور بغاوت کی کامیابی کے امکانات بھی نہایت کم ہوتے ہیں۔ پھر بھی کچھ ایسے سر پھرے ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں جو فائدہ و نقصان کی سوچ سے ماورا ہو کے معاشرے کی ان رسوم و رواج اور ان کاموں کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر ہی دیتے ہیں جو ان کے خیال میں انسانوں کے لیے باعثِ نقصان یا باعثِ تذلیل ہوں۔ ان کو اپنی کامیابی کا یقین ہو یا نہ ہو لیکن ان کو کم از کم یہ دھن لگی رہتی ہے کہ بقولِ ساحر لدھیانوی

بھڑکا رہے ہیں آگ لبِ نغمہ گر سے ہم
خاموش کیا رہیں گے زمانے کے ڈر سے
ہم
مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے
ہم [i]

اور یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو سماج میں مثبت تبدیلی لانے کا سبب بنتے ہیں۔ خود ان کی ذات کو فائدہ ہو یا نقصان اس سوچ سے اوپر اٹھ کر وہ معاشرے کے کمزور، بے بس اور متاثرہ افراد کی خاطر سماج کے ان منفی رویوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور آخر کو ان کمزور، بے بس اور متاثرہ افراد کے مسیحا بن کر ان کی زندگیوں میں رونق اور تبدیلی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو جرأتِ رندانہ کے مالک ہوتے ہیں اور جب بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں تو پھر پیچھے ہٹنے کا نام نہیں لیتے ہیں۔ یہ افراد ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں جو اس کے منفی رویوں کے ناقد ہوتے ہیں۔ اردو ادب میں خصوصیت کے ساتھ ہندوستانی معاشرت کا عکس ملتا ہے۔ سماجی ماحول کے بیان میں مصنف عموماً اپنے گرد و پیش کے ماحول کی آئینہ داری کرتا ہے۔ ہمارے معاشرے کے اولین ناقد ہمارے شاعر و ادیب ہوتے ہیں جو ہر منفی رویے کو اپنی تخلیقات اور کرداروں کی زبانی بیان کر کے اس کے نقصان سے افرادِ معاشرہ کو آگاہ کرنے کے

جتن کرتے رہتے ہیں۔ان ناقدین میں سے ایک نام ڈاکٹر رشید جہاں کا بھی ہے جنھوں نے اپنی تخلیقات میں سماج کے منفی رویوں پر کڑی تنقید کی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر حنیف فوق کا کہنا ہے کہ

> ہمارے ادب میں سماج کے رستے ہوئے زخموں کی مصوری سب سے پہلے انگارے کے ذریعے سے کی گئی۔رشید جہاں،احمد علی،اور سجاد ظہیر کے تلخ اور تیز نشتروں نے ہلچل سی مچادی۔وہ تہہ در تہہ حجاب جن میں زندگی کو پوشیدہ رکھا گیا تھا،چاک کر دیئے گئے۔[ii]

ڈاکٹر رشید جہاں نے اپنے افسانہ "استخارہ" میں ایک مظلوم دلہن کی زبانی روداد بیان کی ہے کہ اس کا شوہر مولوی خادم علی کوئی بھی کام استخارے کے بغیر نہیں کرتا تھا حتی کہ اس کی تیسری بیوی کے زچگی کے موقع پر بھی استخارہ کرنے کو معتبر سمجھتا ہے کہ آیا بیوی کی زچگی گھر میں کسی دائی کے ذریعے ہو یا ہسپتال لے جایا جائے۔ایسے میں اس کی مظلوم و بے بس بیوی استخارے کی نذر ہو جاتی ہے۔ہندوستانی معاشرے میں استخارہ کے حوالے سے بہت عجیب وغریب قسم کے مناظر دیکھنے کو اور سننے کو ملتے ہیں۔نعوذ باللہ استخارہ کو مفاد پرستوں نے معاشرتی استحصال کا ذریعہ بنالیا ہے عوام کی جہالت اور مذہب و مذہبی معاملات سے ناآشنائی کے بموجب اس سے فائدہ اٹھایا جاتا رہا ہے۔مثلاً افسانہ "آصف جہاں کی بہو" میں لوگوں کے عمومی رویے کے بارے میں کچھ اس طرح سے لکھتی ہیں کہ

> یہی اچھا ہوا اللہ نے اپنا فضل کر دیا اور میم کی نوبت نہ آئی۔۔۔بس بیوی کچھ نہ پوچھو۔۔۔۔تم بیویاں تو جھوٹ موٹ ہاتھ پاؤں پھیلا دیتی ہو۔بچہ تو جبھی ہو گا جب اللہ کا حکم ہو گا۔میم آکر کیا بنا لیتی۔الٹے سیدھے اوزار ڈالنے شروع کر دیتی۔ذرا دیر ہوئی تو کہنے لگتی ہو میم کو بلاؤ،میم کو بلاؤ۔جب یہ اجڑی میمیں نہ تھیں تو کیا کوئی عورت بچہ ہی نہ جنتی تھی۔[iii]

لیکن یہاں تو معاملہ ایک مذہبی ٹھیکیدار اور ریاکار مولوی کا ہے جو استخارے کے بغیر ایک قدم تک اٹھانے کا روادار نہیں ٹھہرتا ہے۔رشید جہاں ایک زمانہ شناس خاتون تھیں اور وہ ایسے تمام حالات و واقعات کی نہ صرف نشاندہی اور تنقید کرتی نظر آتی ہیں بلکہ افسانے کو منطقی انجام تک پہنچاتی ہیں مثلاً افسانہ "استخارہ" میں دیکھیے کہ

> کنیز اب اتنی سخت بیمار تھی اور بچنے کی کوئی امید نہ تھی لیکن سانس ہے تو آس ہے۔۔۔۔۔خادم علی نے پہلی دفعہ استخارہ کی بغیر اجازت ایک کام کیا اور وہ یہ تھا کہ جا کر لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائے[iv]

دیکھا جائے تو مولوی خادم علی کو جب ہوش آیا تو اس وقت کنیز اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھی تھی لیکن افسانے میں اُمید کا یہ پہلو ضرور نکلتا ہے کہ ڈاکٹر کے پاس جانے اور ادویات سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ سماجی شعور بیدار ہوا اور نہ جانے کتنی زندگیاں یوں موت کی بھینٹ چڑھنے سے بچ گئی ہوں گی۔ڈاکٹر رشید جہاں ترقی پسند مصنفین میں ایک اہم نام ہے۔انجمن ترقی پسند مصنفین کے اغراض ومقاصد کے سلسلے میں بنیادی رہنمائی،وہ اعلان نامہ ہے جو لندن میں باہم مشورے سے تیار کیا گیا اور لکھنو میں منعقدہ پہلے جلسے میں اتفاق رائے سے منظور ہوا۔اس اعلان نامہ میں واشگاف الفاظ میں کہا گیا کہ

> ہندوستانی سماج میں بڑی بڑی تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں،پرانے خیالات اور معتقدات کی جڑیں ہلتی جارہی ہیں۔اور ایک نیا سماج جنم لے رہا ہے۔۔۔۔ادیبوں کا فرض ہے کہ ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کریں۔۔۔۔ان کا فرض ہے کہ وہ ایسے ادبی رجحانات کو نشوونما پانے سے روکیں،جو فرقہ پرستی،نسلی تعصب

اور انسانی استحصال کی حمایت کرتے ہیں۔۔۔۔ہم چاہتے ؛ہیں کہ ہندوستان کا نیا ادب ہماری زندگی کے بنیادی مسائل کو موضوع بنائے۔یہ بھوک ،پیاس ،سماجی پستی اور غلامی کے مسائل ہیں۔ہم ان تمام آثار کی مخالفت کریں گے جو ہمیں لاچاری، سستی اور توہم پرستی کی طرف لے جاتے ہیں۔[v]

سماجی جبر کا شکار ایک ٹوٹتے سماج اور اس کے اندر سے بغاوت کی ابھرتی لکیروں کی تصویر کشی سے افسانہ نگاروں نے جہاں کہانی میں عصری حسیت پیدا کی وہاں ترقی پسندی کے مادی نظریہ زندگی کی بنیاد پر ایک بڑے سماجی انقلاب کا پیغام بھی عام کیا۔اسی سماجی صورتحال کے تناظر میں رشید جہاں کا افسانہ ''پن'' قابل ذکر ہے۔یہ سماجی تضادات کی بہترین عکاسی کرتا ہے۔زیر نظر افسانے میں ایک نوجوان کی کہانی بیان کی گئی ہے جو گھر سے نکلتا ہے اور دن ڈھلے تک تضادات سے بھرپور واقعات کا ازخود نہ صرف مشاہدہ کرتا ہے بلکہ اپنی رائے کا بھی بھرپور اظہار کرتا ہے جیسا کہ وہ ایک جانور کو مندر کے سامنے دیکھتا ہے جو نہایت لاغر ہے اور قریب الموت ہے تو ایسے میں وہ مندر کے پنڈت سے سوال کرتا ہے کہ

پنڈت جی اتنے دنوں سے یہ گدھا مندر کے سامنے پڑا دم توڑ رہا ہے۔اس کا کچھ بندوبست نہیں کیا گیا؟۔۔۔۔کوئی ہمارا ہے؟جس کا ہے اس کا ہے وہ آپ بندوبست کرے''۔۔۔۔۔یہ تو بڑا ظلم ہے اس غریب کے گولی ہی مار دینی چاہیے کہ وہ اس مصیبت سے تو چھٹی پائے۔۔۔۔رام،رام،رام یہ تو ہتھیا ہے جان لینا بڑی ہتھیا ہے!اور یہ جو چار روز سے ہتھیا ہو رہی ہے؟ایشور کی مرضی،سیتا سیتا رام کہتے ہوئے وہ چلے گئے۔[vi]

مندرجہ بالا اقتباس ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کررہا ہے کہ جہاں انسانیت کا رشتہ محض دکھاوے کے ساتھ منسلک رہ گیا ہے۔جھوٹی مذہب پرستی جس میں ایمان کو کوئی دخل نہیں جو اپنے نفس کو اور دوسروں کو دھوکا دیتی ہے۔بے چارگی و بے بسی انسانوں اور جانوروں میں ضم ہو چکی ہے۔کہیں انسانوں کو انسانیت کے درجے سے نیچے گرایا جا رہا ہے تو کہیں بے زبان جانوروں کے مقام و مرتبے میں تعصب کا عالم اس قدر ہے کہ انہیں بے رحمی کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔جب سماجی صورتحال بگاڑ کی تمام حدیں پار کرلے تو ایسے میں بغاوتی عناصر کا جنم لینا کوئی انہونی بات نہیں ہوتی۔ڈاکٹر حمیرا اشفاق اپنی کتاب ''نثر رشید جہاں'' میں رشید جہاں سے متعلق لکھتی ہیں ''انہوں نے عورت کے مسائل کو صنفی نظر سے ہی نہیں بلکہ بطور انسان اس کی شخصیت کا ادراک اور اظہار بھی کیا ہے۔ان کے نسوانی کردار صرف اپنے ذاتی مسائل کے دکھ کا بوجھ ہی نہیں اٹھاتے بلکہ اجتماعی معاشرتی شعور کا اظہار بھی کرتے ہیں۔''[vii] مذہبی معاملات سے متعلق ان کا افسانہ ''افطاری'' جھوٹے مذہب پرستوں کے خلاف بغاوت کا منظرنامہ لیے ہوئے ہے۔اس افسانے میں رشید جہاں نے اس طبقے کی حقیقت سے آگاہ کیا ہے جو اسلام اور اسلامی معاملات کی حقیقی معنویت سے بے خبر ہیں اور مذہب کے اجارہ دار بنے بیٹھے ہیں اور ایسے افراد معاشرہ جو مفلسی و تنگ دستی کا شکار ہیں ان کی تضحیک کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے ہیں۔وہ حقوق اللہ کو حقوق العباد پر نہ صرف فوقیت دیتے ہیں بلکہ حقوق اللہ کی معنویت سے ناآشنا ہیں کہ درحقیقت حقوق اللہ سے مراد کیا ہے؟جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق پر بندوں کے حقوق کو ترجیح دی ہے۔ڈاکٹر رشید جہاں اس سماجی صورتحال کے متعلق افسانہ ''افطاری'' میں ایک مقام پر لکھتی ہیں کہ

ان مسجدوں کے ملاؤں میں ایک قسم کی بازی لگی رہتی تھی کہ کون ان جاہل غریبوں کو زیادہ الو بنائے اور کون ان کی گاڑھی کمائی میں سے زیادہ ہضم کرے۔یہ ملّا بچوں کو قرآن پڑھانے سے لے جھاڑ پھونک۔تعویذ۔گنڈا غرض کہ ہر ان طریقوں کے استاد تھے کہ جس سے وہ ان جلاہوں اور لوہاروں کو بے وقوف بنا سکیں۔یہ تین بیکار اور فضول خاندان ان محنت کرنے والے انسانوں کے بیچ میں اس طرح سے رہتے تھے کہ جس طرح گھنے جنگلوں میں دیمک رہتی ہے اور آہستہ آہستہ درختوں کو چاٹتی رہتی ہے۔۔۔۔یہ ملّا صاحبان سید اور شریف زادے تھے اور یہ محنت کش

رذیل اور کمینوں میں گنے جاتے تھے۔۔۔۔ نماز روزہ کا ایک سود کھانے والا خان بڑا پابند ہوتا ہے اور اپنے آپ کو سچا مسلمان سمجھتا ہے۔[viii]

ڈاکٹر رشید جہاں نے بہت خوبصورتی سے اس تلخ معاشرتی حقیقت سے پردہ اٹھایا ہے۔وہ جس دور میں افسانہ نگاری کے میدان میں آئیں وہ نو آبادیاتی ہندوستانی معاشرہ تھا جہاں مختلف مذاہب، قومیں، تمدن، روایات اور مختلف کلچر آپس میں نبرد آزما تھے۔نو آبادیاتی معاشرے میں مقامیوں کے ساتھ جو برتاؤروا رکھا گیاہندوستانی تاریخ اس کی شاہد ہے۔مقامیوں کی شناخت کو ختم کرنے اور غلامانہ رجحان کو پروان چڑھانے کے لئے سیاسی وسماجی، ذہنی وجسمانی اور دیگر مختلف نفسیاتی حربوں سے ان کو ان کی کم مائیگی کا احساس ہر موقع پر دلایا گیا۔اس سماجی صورتحال کا بہترین عکاس ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ ''مجرم کون؟'' ہے۔اس میں ایک انگریز جج رابنسن کے عشق کی کہانی ہے وہ ایک شادی شدہ عورت کو طلاق دلوا کر خود ولایت جا کر اس سے شادی کرتا ہے۔

دو انگریزوں میں کھلم کھلا مقدمہ بازی کرنا انگریزی رعب داب میں فرق ڈالتا تھا،لہٰذا ادھر گورنر تک اور ادھر کمانڈر انچیف کے کانوں تک خبر پہنچائی گئی ایک زبردست دباؤ کے بعد کرنل صاحب راضی ہوئے کہ وہ بجائے رابنسن پر دفعہ ۴۹۶ کا مقدمہ چلانے کے، اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔[ix]

اسی افسانہ میں دوسری کہانی "بھولا" اور "گجریا" کی ہوتی ہے۔بھولا اور گجریا شادی کرنا چاہتے ہیں لیکن گجریا کا شوہر اسے طلاق نہیں دیتا تو دونوں گھر سے بھاگ جاتے ہیں اور پھر پکڑے جاتے ہیں۔گجریا کو اس کے شوہر کے حوالے کر دیا جاتا ہے وہ اس کے بعد پورے گھر سمیت جل کر راکھ ہو جاتی ہے اور بھولے کو تین سال کی سزا دی جاتی ہے۔نو آبادیاتی ہندوستان میں قانون کی بناوٹ اس طرز پر کی گئی کہ مقامیوں میں خوف وہراس پیدا کیا جائے اور وہ کسی بھی قسم کے پروپیگنڈے سے کوسوں دور رہیں۔افسانہ میں ایک مقام پر ڈاکٹر رشید جہاں انگریزی قانون کے متعلق لکھتی ہیں کہ

ارے یار بڑا انصاف کرتے ہیں۔۔۔۔ہندوستانی اعلیٰ افسر بھی ان کی بڑی قدر کرتے ہیں۔۔۔۔ قانون کو ایسا سمجھتے ہیں کہ صوبہ میں کم جج ان کا مقابلہ کرتے تھے۔بس یہ کہو کہ اس انگریزی قانون کی جو انہوں نے غلاموں کے لئے بنایا تھا ان سے اچھی ترجمانی کوئی نہ کر سکتا تھا۔ان کو اپنی ایمانداری اور انصاف پر بڑا ناز تھا۔[x]

مذکورہ بالا حالات وواقعات کی عکاسی ہمیں رشید جہاں کے ایک اور افسانہ ''فیصلہ'' میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ہندوستان میں انگریز راج کے اسباب ومحرکات اور پھر ان کے راج کی پاداش میں مقامی اقوام کی زندگیوں پر چھا جانے والی نحوست اور مغلوبیت کی وجہ سے وہاں موجود قومیں شدید تذبذب کا شکار نظر آتی ہیں۔انگریزوں نے اپنے قدم جمانے اور اقتدار واثر ورسوخ کو بڑھانے کی خاطر ہندوستان میں سینکڑوں برس سے آباد ان قوموں کو آپس کے معاملات میں ایسا الجھا دیا کہ وہ مذہب پرستی کی بنیاد پر چلائی گئی سیاسی چالوں کو نہ سمجھ سکے اور لڑنے بھڑنے لگے۔مسز ٹامس۔۔۔۔سب نیٹیو بے ایمان ہوتے ہیں''پھر صفیہ کی طرف دیکھ کر جلدی سے بولیں۔''میرا مطلب ہے سب نیچے طبقہ کے نوکر پیشہ اور قلی لوگ۔۔۔۔''[xi]افسانہ ''فیصلہ''میں کردار "صفیہ" اور "حسن مرزا" ہندو مسلم تعلقات کی کشیدگی اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والے مسائل کو لے کر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ خود مصنفہ کے ذہن میں اٹھنے والے سوالات ہیں جن کے جوابات کی نہ صرف وہ متلاشی ہیں، بلکہ ان کی بھرپور معنویت کے ساتھ وہ اپنے قارئین کو بھی آگاہ کرنا چاہتی ہیں مثلاً افسانے میں ایک مقام پر لکھتی ہیں کہ

صفیہ کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ ہندو مسلمان لڑتے کیوں ہیں۔وکیل برج لال جو حسن مرزا کے بہت ہی اچھے دوست تھے اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے تھے کہ یہ سب قصور انگریزوں کا ہے۔۔۔۔۔سب فضول کی باتیں ہیں۔ہم خود ہی ایسے ہیں، مسجد اور مندر کی اینٹوں پر ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں۔۔۔۔ میں تو ہندو مسلم فساد کو

ایک بیماری خیال کرتی ہوں۔۔۔۔۔آخر جس طرح ملیریا کا کیڑا پکڑا ہی گیا اسی طرح اس کا سبب بھی معلوم ہو سکتا ہے۔ آخر اس کا بھی کوئی نہ کوئی علاج ہو گا۔[xii]

زیر نظر افسانہ کی معنوی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے جب ہندوستانی سماج میں تعلیم کو سماجی بے راہ روی پھیلانے کا سبب سمجھا جا رہا تھا، وہیں باشعور طبقہ بھی سامنے آتا ہے جو تعلیم کی حقیقت سے واقف ہے اور جہالت اور اس کے مضر اثرات کے خلاف علم بلند کرتا دکھائی دیتا ہے۔ہندوستانی معاشرے میں تعلیم بالخصوص تعلیم نسواں کو معاشرتی بگاڑ کا سبب گردانا جاتا رہا ہے، اس حقیقت کو "رشندی دیوی" (۱۸۰۹ء-۱۸۹۸ء) نے اپنی خودنوشت میں لکھا، جس کا ذکر زاہدہ حنا نے اپنی کتاب میں یوں کیا ہے "اپنی اس خواہش پر میں خود کو برا بھلا کہتی، سوچتی کہ شریف بہو بیٹیاں بھی کہیں پڑھتی یا لکھتی ہیں؟لوگ پڑھی لکھی عورتوں کو برا سمجھتے۔بڑی بوڑھیاں کسی لڑکی یا عورت کے ہاتھ میں کاغذ کا کوئی ٹکڑا دیکھ لیتیں تو ہاہا کا شور مچا دیتیں۔[xiii]یہی صورتحال ہمیں ڈاکٹر رشید جہاں کے افسانہ میں نظر آتی ہے کہ جب صفیہ کی ماں تعلیم کی اہمیت پر بات کرتی ہے اور فیصلہ کر لیتی ہے کہ وہ اپنی بیٹیوں کو لازماً زیور تعلیم سے آراستہ کریں گی تو اسے مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

اپنی تعلیم کی کمی کا احساس ان کو ہر منٹ رہنے لگا۔اگر آج پڑھی لکھی ہوتیں تو اس مصیبت میں کتنا کام آتا۔انہوں نے ارادہ کر لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اپنی لڑکیوں کو ضرور پڑھوائیں گی۔سارے کنبے نے مخالفت کی۔لیکن انہوں نے ایک نہ مانی۔اور پاس کے مشن اسکول میں لڑکیوں کو پڑھانا شروع کیا۔[xiv]

لڑکیوں کی تعلیم کے حوالے سے اور کسی دوسرے کے خطوط کو بغیر اجازت کھول کر پڑھنے کے متعلق ایک اور مقام پر وہ لکھتی ہیں کہ

چند ہی روز بعد ہی ایک کمی جو اس نے اپنے میاں میں محسوس کی جس سے اس کو بہت رنج ہوا وہ یہ تھی کہ حسن مرزا اس کے خط کھول کر پڑھ لیتے تھے۔اس کی پرنسپل مس مارٹن نے صفیہ کو بتایا تھا کہ یہ بہت ہی کمینی حرکت ہے۔اور کوئی انسان یہ بات کرے تو وہ شرافت کے معیار سے گر جاتا ہے۔شروع شروع میں تو وہ چپ رہی۔پھر جب ہر دفعہ ہی یہ بات دیکھی تو ایک دن کہنے لگی "حسن آپ میرے خط کھول لیتے ہیں اچھا کرتے ہیں لیکن اگر مجھ سے پوچھ لیتے تو اجازت تو میں بھی دے دیتی۔۔۔۔ایک ہندوستانی عادت ان میں تھی کہ کسی کے خط پڑھ لینے کو وہ برا خیال نہ کرتے تھے۔ان کے خاندان میں تو کوئی خط پرائیویٹ ہوتا نہیں تھا۔ان کے چچا نے ایک دفعہ بھتیجی کا خط جو اس نے اپنے میاں کو لکھا تھا کھول کر پڑھ لیا تھا اور پھر وہ آفت اٹھائی تھی کہ "اور پڑھاؤ لڑکیوں کو اردو۔یہ دیکھو کیا عاشقانہ خط لکھا ہے۔سارے گھر کو وہ خط پڑھوایا گیا۔۔۔۔اس دن کے بعد سے اس نے میاں کو میکے سے خط ہی نہ لکھا تھا۔[xv]

ان کے افسانوں میں حسن و خیر کی تلاش اور سماج سدھار کا مقصد واضح ہوتا دکھائی دیتا ہے کیونکہ غلامی، عدم تحفظ، عدم مساوات، جہالت، اقتصادی بدحالی نئی زندگی ایسے حالات تھے کہ جو جدید ذہن کے لئے قابل قبول ہی نہ تھے۔چنانچہ عدم اطمینان، احتجاج، بغاوت اور تندی و تلخی نئی نسل کے ذہنوں میں کلبلانے لگی تھی۔ڈاکٹر رشید جہاں نے ان تمام اساسی اصولوں پر حملے کیے ہیں جو بزرگوں کے نزدیک قابل تعظیم تھے۔وہ جدید تعلیم سے آراستہ اور بیرون ملک کی علمی و ادبی صورت حال سے بخوبی واقف تھیں۔بدلتا عالمی منظر نامہ اور ہندوستان کا ماضی و حال ان کی نظر میں تھا۔ان دنوں اشتراکی نظریات ساری دنیا کے نوجوان ذہنوں میں گرمی پیدا کر رہے تھے اور جرات و بے باکی کی ایک منفرد روایت نے جنم لیا جس کی بدولت ادب کے تسلسل میں بھی تیزی آئی اور حقیقت و صداقت کے عمل کو بھی تقویت ملی۔ڈاکٹر محمد صادق کے نزدیک "انگارے کے مصنفین نہ تو سیاستدان یا مصلح قوم تھے اور نہ مذہب کے

ٹھیکیدار۔انہوں نے اپنے افسانوں میں عصری زندگی کے مسائل کو جرات مندی کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب سعی کی۔"[xvi]ڈاکٹر رشید جہاں کے ہاں ہمیں مردانہ سماج کے خلاف احتجاج دکھائی دیتا ہے۔لیکن وہ عورت کو ویسی آزادی دینے کی قائل نہیں نظر آتی ہیں جو مغرب کی دین ہے۔وہ عورت کو کسی بھی معاشرے کی بلا تفریق مشرق و مغرب کے ایک باہمت اور پر اعتماد کردار کے طور پر دیکھنے کی خواہشمند نظر آتی ہیں۔وہ عورت کی مظلومیت، تعلیم، ایثار اور استقامت کے ساتھ ساتھ اس کی مزاحمت، سماجی تضادات، نفسیاتی الجھنوں اور مصنوعی حدبندیوں کو بھی موضوع بناتی ہیں۔مثلاً افسانہ "چھدا کی ماں" جو بظاہر ایک کرداری افسانہ کہا جاسکتا ہے اور عورت کے استحصال اور مظلومیت کا بہترین عکاس ہے، اس میں عورت کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جارہا ہے۔شادی کرنا اور پھر اس کے بعد بغیر کسی مدلل جواز کے طلاق دے دینا، کوئی معیوب فعل نہیں سمجھا جارہا ہے۔اس حوالے سے رشید جہاں افسانے میں ایک جگہ لکھتی ہیں کہ

> دھوبی ہے وہ کئی بدل چکا ہے،مالی ہے اس کی یہی حالت ہے۔عیدو بھی دو کو طلاق دے چکا ہے ان کمبختوں کے ہاں اس بات کو کوئی برا نہیں سمجھتا ہے۔عورتیں ہی اس ملک میں اتنی سستی مل جائیں تو میں کیا کروں"[xvii]

کم و بیش یہی صورتحال اور حقوق نسواں کے متعلق افسانہ "سلمیٰ" میں ہے۔رشید جہاں کردار سلمیٰ کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کرتی ہیں کہ "ہندوستان میں مسلمان عورتیں آخر کون سے حقوق رکھتی ہیں۔کسی معاملے میں ہماری کوئی آواز نہیں۔۔۔۔اور کسی سے یہ کہنے کی ہمت نہیں رکھتی کہ میں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"[xviii]افسانے میں چھدا کی ماں کو ایک ظالمانہ تضاد کی طرح پیش کر کے انسانی نفسیات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔وہ ہر سال ایک نئی بہو لاتی ہے اور پھر بغیر کسی خاص وجہ کے چھدا سے طلاق دلوادیتی ہے۔چھدا کو اپنی کسی بیوی سے کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن ماں کو جب کہیں کوئی نقص نظر آتا تو فوراً طلاق کا حکم صادر کر دیتی اور وہ بغیر کسی چوں چاں کے طلاق دے دیتا۔وہ ماضی میں سسرال کی طرف سے اپنے ساتھ ہونے والے تمام مظالم کا بدلہ اپنی بہوؤں سے طلاق کی صورت میں لیتی تھی۔بس اضطراب، ہیجان، بے چینی اور غم و غصے کی حالت میں سب کچھ روند ڈالنے کی کیفیت ہے۔اسی کیفیت کی چھدا کی ماں خود بھی شکار ہوئی اور دوسروں کو بھی اس نے شکار کر لیا۔چھدا کی ماں جب نئی بہو لاتی ہے تو وہ بغاوت پر اتر آتی ہے اور خلافِ اخلاقیات ایسے اقدامات اٹھاتی ہے جو معاشرے کے لئے قابل قبول نہیں ہوتے لیکن اس سے بہت سے لوگوں کی زندگیاں بچ جاتی ہیں۔مثلاً

> "بڑھیا نے وہی حرکتیں شروع کی تھیں، لیکن یہ لڑکی بڑھیا کے جوڑ کی ہے۔ایک دن پکڑ کر ساس کی وہ مرمت کی کہ سب بہوؤں کا بدلہ نکال لیا اور کہنے لگی کہ میں یہ دہلی چھوڑ کر نائے جاؤں گی۔وہ اور ہی ہوں گی جو نا جانے وہ کس کی دھی بیٹیاں تھیں جو چلی گئیں۔جو تجھے اس گھر میں رہنا ہے تو رہ ورنہ جا اپنا رستہ پکڑ۔۔۔۔اور چھدا"۔۔۔وہ تو اس بیوی کا غلام ہو گیا ہے۔یہی بڑھیا سے دیکھا نہیں جاتا۔لیکن بیٹی اصل بات یہ ہے کہ عورت عورت میں فرق ہوتا ہے"[xix]

اگر غائر نظر سے جائزہ لیا جائے تو اس عہد میں انتشاری صورتحال تھی اور جبر کا کوئی بھی زاویہ قابل قبول نہیں تھا۔مذہب، معاشرت، اخلاق، تہذیب و ثقافت اور روایات سب کو جبر کی مختلف صورتیں قرار دے کر ان کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا جو بغاوت بن کر ابھرا اور سامنے آیا۔ڈاکٹر رشید جہاں اپنی کہانیوں میں اکثر مقامات پر غصے اور نفرت پر قابو نہیں رکھ پاتیں اور پھٹ پڑتی ہیں۔اور ایک بے باک افسانہ نگار کے طور پر سامنے آتی ہیں جو بنا کسی لگی لپٹی کے اپنے جذبات واحساسات کا برملا اظہار کرتی ہیں۔ان کے افسانوں میں سماجی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زیادہ ہے۔انہوں نے روایتی طرز فکر کی مذمت کی ہے اور حقائق واقعی کو فن پارے کی بنیاد بنایا ہے۔خارج اور داخل کی تمام حقیقتوں کو بے نقاب کیا ہے۔ڈاکٹر رشید جہاں کے افسانوں میں تعمیر و انقلاب کی اُمنگ پائی جاتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ سماج سدھار نظریہ بھی دکھائی دیتا ہے۔وہ ایک ایسے معاشرے کی ترجمانی کر رہی تھیں

جہاں سب کچھ بدل دینے اور حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لینے کا اول اول تو کوئی شائبہ تک نہ تھا لیکن بعد ازاں اسی گھٹن زدہ معاشرے میں بغاوت جنم لینے لگی اور استحصالی قوتوں کی سرکوبی کے لیے لائحہ عمل کا قیام عمل میں لانے کی کوششیں کی گئیں۔ اور خواتین افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر رشید جہاں ان باغیوں کے سرخیلوں میں شمار ہو گئیں۔

حوالہ جات

i ساحر لدھیانوی، کلیاتِ ساحر۔ العصر پبلی کیشنز مسعود منزل بک سٹریٹ ۱۴-مزنگ لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴۳

ii حنیف فوق، ڈاکٹر، اردو ادب میں ترقی پسند تحریک، مشمولہ سر سید ین، پاکستانی ادب، ۱۹۸۲، ص ۳۴۷

iii رشید جہاں، ڈاکٹر، شعلہ جوالہ، نصرت پبلیکشنز، لکھنو، ۱۹۶۸، ص ۴۷

iv رشید جہاں، ڈاکٹر، عورت اور دیگر افسانے، ہاشمی بک ڈپو، لاہور، ۱۹۳۷، ص ۱۴۴

v علی سردار جعفری، ترقی پسند ادب، انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ، ۱۹۵۱، ص ۱۴، ۱۳

vi رشید جہاں، ڈاکٹر، عورت اور دیگر افسانے، ہاشمی بک ڈپو، لاہور، ۱۹۳۷، ص ۸۶

vii حمیرا اشفاق، ڈاکٹر، نثر رشید جہاں "افسانوں ڈراموں اور مضامین کا انتخاب"، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۲، ص ۱۵

viii رشید جہاں، ڈاکٹر، شعلہ جوالہ، نصرت پبلیکشنز، لکھنو، ۱۹۶۸، ص ۴، ۳

ix ایضا، ص ۱۵

x ایضا، ص ۱۴

xi ایضا، ص ۵۳، ۵۲

xii ایضا، ص ۴۴، ۴۳

xiii رشندی دیوی، بحوالہ: زاہدہ حنا، عورت زندگی کا زنداں (کراچی: شہرزاد، ۲۰۰۴ء)، ص ۱۴۴

xiv رشید جہاں، ڈاکٹر، شعلہ جوالہ، نصرت پبلیکشنز، لکھنو، ۱۹۶۸، ص ۴۰، ۳۹

xv ایضا، ص ۴۲، ۴۱

xvi محمد صادق، ڈاکٹر، ترقی پسند افسانے کے پچاس سال، مشمولہ ترقی پسند ادب، ۱۹۸۲، ص ۳۷۷

xvii رشید جہاں، ڈاکٹر، شعلہ جوالہ، نصرت پبلیکشنز، لکھنو، ۱۹۶۸، ص ۳۸

xviii ایضا، ص ۱۵۸

xix ایضا، ص ۳۸